بلوے ہوئے جن میں مرنے والوں کی تعداد ساڑھے چھ لاکھ ہے۔ مالی طور پر مسلمانوں کا نقصان ۴۳ تا ۷۳ ارب روپے کا ہوا۔ سن ۱۹۶۰ء کے بعد مسلمانوں کی تباہ کاری کا جو کارنامہ انجام دیا گیا اس کا حساب شامل کیا جائے تو مسلم کشی کے ہنگامے ۵ ہزار تک پہنچتے ہیں۔

۲۲ ـــ اب آسام کی داستان کی تلخیص ملاحظہ فرمائیے:۔

(۲)

آسام خون آشام کی قیامت کا پہلے پس منظر ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی بار جب مسٹر باردولی ناتھ کی کانگرسی وزارت قائم ہوئی (۱۹۴۵ء) تو اس وقت ایک لاکھ مسلمانوں کو نکال باہر کیا گیا۔ کیا یہ کوئی چھوٹا حادثہ ہے؟

مسلمانوں کو آسام سے نکالنے کے لئے دوسری کوشش ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کی گئی جب کہ گوپھاڑہ، جنگل دائی اور دوسرے علاقوں میں بڑے بڑے بلوے ہوئے۔ بہت سے مسلمان بھاگ کر بنگلہ دیش میں داخل ہوگئے۔ پھر اقلیتوں کے تحفظ کے لیاقت نہرو معاہدے (۱۹۵۰ء) کے تحت آسام چھوڑنے والوں کو واپس بلایا گیا۔ مگر ان کی زمینیں ان کو نہیں دی گئیں۔ یہاں سے متعصب اور مسلم دشمن ہندوؤں میں نئے عزائم بیدار ہوئے۔

آسامی مسلمانوں پر حملوں کا تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب پنڈت نہرو کے دور میں بھارت کی شمال مشرقی سرحد (معروف بہ "نیفا") سے مسلمانوں کو جبراً بے دخل کیا گیا۔ ان کی جملہ املاک اور زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ فخرالدین علی احمد کے دورِ وزارت میں مسلمانوں کو غیر محب وطن قرار دینے پر سخت احتجاج ہوا اور ساتھ ہی مسلم کش بلوے شروع ہوگئے۔ فخرالدین علی احمد (جو بعد میں بھارت کے صدر بھی بنے) اور معین الحق چودھری احتجاجاً عہدوں سے مستعفی ہوگئے مگر اس احتجاج کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ لاکھوں مسلمان تباہ کر دیئے گئے اور جو بچ سکے وہ بھاگ کر دریائے برہم پترا کی ترائی میں نوگاؤں، گولپاڑہ اور گوپھاڑہ وغیرہ کے علاقوں میں بس گئے اور بڑی خستہ حالی کی زندگی گزارنے لگے۔

موجودہ ہنگاموں کا سررشتۂ آغاز وہ ایجی ٹیشن ہے جو ۱۹۷۹ء میں جنتا پارٹی کی ہزاریکا وزارت کو برطرف کر کے صدر راج نافذ کرنے پر ابھرا۔ یہ ایجی ٹیشن جو مرکزی حکومت کی پالیسی اور غیر آسامی

آبادی کے حق رائے دہی کے خلاف اٹھا تھا اسے راشٹریہ سیوک سنگھ کے دو وزراء نے فرقہ وارانہ کشیدگی کی طرف موڑنے کی کوشش کی اور مسلم دشمنی کے جذبات کو خوب بھڑکایا۔ مسلمانوں کو غیر قانونی مداخلت کار قرار دے کر ان پر حملوں کا آغاز کرایا گیا۔ اٹل بہاری باجپائی کے علاوہ خود اندرا گاندھی [1] کو بھی یہی پسند ہوا کہ آسام کی ساری آبادی کے اندر علاقائی تصادم کے بجائے قضیئے کا رخ مسلمانوں کی طرف موڑ دیا جائے۔ اے اے ایس یو (آل آسام اسٹوڈنٹس یونین) نے جو آسام کے بلوے دو رہنگامہ کو چلانے میں بڑی حصہ دار قوت رہی ہے۔ نومبر ۸۰ء میں یہ کھلا الزام لگایا تھا کہ بھارتی حکومت سارے قضیئے کو ہندو مسلم تصادم میں بدلنے کے لئے یہ چاہتی ہے کہ ان سے غیر قانونی مداخلت کاروں کا سا معاملہ کیا جائے اور باہر سے آمدہ ہندوؤں کو پناہ گزین قرار دیا جائے۔ چنانچہ بات یہاں تک پہنچی کہ پہاڑی قبائلیوں کو بڑی آسامی تحریک سے الگ رکھنے اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کے خلاف وحشت کاری کرنے کے لئے ایک جداگانہ ضلع بنا کر دینے کی پیشکش بطور رشوت کی گئی۔ اسٹوڈنٹس یونین کا یہ کہنا ہے کہ یہ چال ہماری اصل تحریک کو تباہ کرنے کے لئے چلی گئی ہے۔

دیرینہ آسامی ایجیٹیشن کو نوجوانوں کی دو تنظیمیں چلا رہی تھیں، ایک آل آسام اسٹوڈنٹس یونین، دوسری گنا سنگرام پریشد پیپلز ریولیوشنری کمیٹی۔ اس کی نذر کسی طرح مسلمانوں پر اول درجہ میں نہیں پڑتی تھی۔ اس کا ثبوت غیر آسامی آبادی کے درج ذیل باوثوق اعداد و شمار ہیں:۔

باہر سے اکھڑ کر آنے والے لوگ ۲ لاکھ ۴۱ ہزار

(یہ تمام کے تمام بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ہندو تھے)

غیر قانونی داخل شدگان

ہندو = ۶ لاکھ ۳۱ ہزار
بودھ = ۶۵ ہزار
عیسائی = ۳۰ ہزار
مسلمان = ۲۰ ہزار

میزان کل = ۹ لاکھ ۶۷ ہزار

[1] آپ ذرا خیال کریں کہ یہی اندرا گاندھی مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے اُن کو آسام جا کر تحفظ کا یقین دلاتی ہیں۔ پھر یہی مسلم کشی کی سازشی سرنگ میں بارود بھرتی ہیں۔

دونوں قسم کے غیر آسامیوں کی مجموعی تعداد ۱۱ لاکھ ۸۱ ہزار میں صرف ۲۷ ہزار مسلمان شامل ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ بقیہ مذاہب کے لوگوں کی بھاری تعداد کو چھوڑ کر صرف ۲۷ ہزار مسلمانوں کے خلاف لاوا اُبل پڑا اور صرف وہی غیر آسامی مداخلت کار قرار پائے۔ (وزارت داخلہ کے فراہم کردہ اعداد و شمار بتاریخ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۲ء۔ بحوالہ امپیکٹ لندن)

یہ کاشی چندر سیٹھی کا بیان ہے کہ آسامی طلبہ اور دیگر آسامیوں کی تحریک تمام غیر آسامیوں کے خلاف تھی اور اس کا اصول عدم تشدد مقرر تھا۔ بعد میں مختلف افراد اور عوامل نے تحریک کا رُخ بدل دیا اور اُس میں غیر متعلقہ عناصر شامل کیے گئے۔ اس تبدیلی کا الزام آسامی تحریک والوں نے بعض متعصب ہندو لیڈروں اور وزیروں کے علاوہ خود اندرا گاندھی پر لگایا ہے۔

حالیہ سلسلہ واقعات یوں ہے کہ آسام میں گوہاٹی کے صوبائی مرکز سے صرف ۵۴ کلومیٹر دور (یعنی کار کی ۱/۲ گھنٹے کی مسافت) نیلی نامی آبادی کے آس پاس مسلمانوں کے ایک درجن گاؤں تھے اور اُن کی تعداد دس ۱۵ ہزار تھی۔ اس مسلم علاقے کے ارد گرد ہندو آبادی کا بڑا گھیرا تھا۔ جو عرصہ سے فتنہ و شورش کی تیاری میں تھے۔ اور اسلحہ جمع کر چکے تھے۔ اور ان کو سرکاری پولیس اور ملیشیا کا پورا تعاون حاصل تھا۔

یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ مشہور مسلم دشمن اور متعصب جن سنگھی لیڈر اٹل بہاری باجپائی متعدد بار آسام گئے اور انہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کرکے ہنگامہ اُٹھانے والوں کا ساتھ دیا۔ انہوں نے مجوزہ کارروائیوں اور منصوبوں کے سلسلے میں مشورے بھی دیئے۔ بھارت کی دوسری فرقہ پرست جماعتوں کے لوگوں نے بھی آسام میں جا کر غیر آسامیوں کے خلاف اُٹھنے والے طوفان کا رُخ مسلمانوں کی طرف موڑ دیا۔ خود مسز اندرا گاندھی کا منشا بھی یہی تھا کہ آنے والی تباہی کا شکار مسلمان ہوں۔

ضلع دارنگ کے منگلدوئی کے مقام پر مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنا جہاں آئے دن بیرونی لوگ آکر شریک ہوتے رہے۔ نیلی کے مسلمانوں کے خلاف ۱۴ فروری کی ووٹنگ کے انتقام میں ہندوؤں نے اولاً مکمل سماجی مقاطعہ شروع کیا۔ اور پھر قتلِ عام کے پہلے راؤنڈ میں گوہ پور کے علاقے میں قبائلیوں آسامیوں اور نیپالیوں نے مل کر ۱۷ دیہات کو نذرِ آتش کر کے ایک ہزار افراد کو ہلاک کر دیا۔ جمعہ ۱۸ فروری کی روشن صبح کو نیلی کے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ مرد چونکہ کام پر جا چکے تھے اور کچھ بھاگ بھی نکلے تھے اور ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ انہیں سرکاری انٹیلی جنس والوں نے خطرے سے بچنے

کے لیے بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ اس لیے قتل عام کا شکار ہونے والوں میں ۸۰ فیصد عورتیں اور بچے تھے۔ عورتیں بچوں کو لے کر دھان کے ڈھیروں میں جا چھپیں مگر قاتلوں نے شیر خوار بچوں کو ماؤں سے چھین چھین کر اُن کے سامنے انہیں چیر پھاڑ دیا۔ اور پھر اُن کی ماؤں کا بھی صفایا کر دیا۔ حتّٰی کہ ضعیف عورتوں کے بدن بھی کاٹ دیئے گئے۔ جمعہ کا سارا دن اور اگلی رات صبح تک یہ خونخوارانہ ڈرامہ جاری رہا۔ جو مرد جنگلوں کی طرف بھاگ نکلے تھے، ان کو درندوں کی ٹولیوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح شکار کیا جس طرح (بالفاظ نیوز ویک) خرگوشوں کا شکار کیا جاتا ہے۔ اس مہم کی سرکردگی نوجوانوں نے کی، جو آسام ماتا کی جے کے نعرے لگا رہے تھے۔

نیلی کے بعد مشرک وحشیوں نے ڈیمل، ماتی پربت، لودیری اور دھرم تلی وغیرہ مسلم دیہات کا رُخ کیا۔ اور قسائی فطرت حملہ آوروں نے انسانی گوشت کے انبار لگا دیئے۔ مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی رہیں کیونکہ اُن کو سمیٹنے کے لیے کوئی مسلمان باقی نہ تھا۔ ان لاشوں کو گدھ اور کوے نوچتے رہے۔ فوج نے جو پہلے سے ایسے بلووں کو روکنے کے لیے مامور تھی، اس نے قاتل درندوں کا ساتھ دیا۔ اور کوئی مثال ایسی نہیں کہ فوجیوں نے مظلوموں کے جان و مال کو بچانے یا ظالموں کا ہاتھ روکنے کی کوئی کوشش کی ہو۔ یہی حال پولیس اور ملیشیا کا تھا۔

نیلی ضلع نوگاؤں کے متعلق عام اطلاعات ۲ ہزار ہلاکتوں کی ہیں۔ مگر دوسری رپورٹوں میں یہ تعداد ۴ ہزار بتائی گئی ہے۔ گھروں اور مکانوں کو جلانے کے علاوہ مویشیوں اور فصلوں کو بھی تباہ کر دیا گیا۔

ہسپتالوں میں متعصب ہندو فرقہ پرستوں کا رویہ یہ تھا کہ دس ہزار مسلمان زخمیوں کو طبی امداد دینے کی بجائے اُن کو طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ اسی طرح جو لوگ کیمپوں میں پہنچے اُن کے لیے کوئی سامان غذا نہ تھا۔ وہ شہدا بھی تھے جن کی لاشیں رب نواز نامی نوجوان کی چشم دید شہادت کے مطابق رات کے وقت بیلی دریا میں بہا دی گئیں۔

مجموعی طور پر اس وقت تک ۳ لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہو چکے ہیں۔

اب آسام کے بقیہ ۲۵ لاکھ مسلمانوں کا حال ایسا ہے کہ وہ ایک مذبح میں پڑے اپنے ذبح ہونے کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ مجرمانہ طوفان جو تین ہفتے جاری رہا۔ اس میں اخباری رپورٹوں کے مطابق ظاہری تعداد مقتولین ۱۰ تا ۱۵ ہزار سامنے آتی ہے۔[1]

اس سارے سانحہ کا سہرا مسز اندرا گاندھی کے سر ہے جنہوں نے مسلمانوں کو تحفظ کا یقین دلا کر اُن سے کانگریس کی کامیابی کے لیے ووٹ ڈلوالئے اور پھر ان کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ وہ اس مقام کا معائنہ کر آئیں جہاں سے لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں، صرف اُن کی بُو باقی تھی، جس سے بچنے کے لیے اندرا گاندھی نے ساڑھی کا پلو ناک پر رکھ لیا۔ اس عورت سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ یہ دلی کرب و اندوہ کا اظہار کم سے کم ایک فقرے ہی میں کر دیتیں یا انتظامیہ اور فوج اور پولیس اور ملیشیا کے خلاف کوئی تحقیقاتی کارروائی کراتیں۔

۱۶ — آخری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اس وقت اخلاقی لحاظ سے بھارت کا معاشرہ پوری طرح بانجھ ہو چکا ہے۔ رشیوں اور مُنیوں، سنتوں اور بھگتوں، سادھوؤں اور بھکشوؤں کی اس سرزمین میں کہیں کوئی ایسی مذہبی تڑپ باقی نہیں جس کا رشتہ رام کرشن یا بودھ اور اشوک سے جوڑا جا سکے۔ گندے شرک اور بے روح سیکولرازم کی فضا میں تمام اعلیٰ اصول اور قدریں ختم ہو گئی ہیں، ورنہ بھارت میں کوئی نہ کوئی ہندو گروہ مُسلم کشی کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا۔ ظلم کے خلاف مذہبی سطح پر کوئی پکار بلند ہوتی۔ سیاست دان بھی سیاسی ہیر پھیر کی باتیں کرتے ہیں، اور وہ بھی زیادہ تر مخالفِ مسلم انداز میں۔ کبھی کوئی اپوزیشن کا لیڈر بولتا بھی ہے تو بااصول سیاست کے زیرِ اثر کوئی ٹھوس بات اور کوئی مضبوط فیصلہ سامنے نہیں آتا۔ بھارت کی جمہوریت کو ایک بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ جمہوریت ایک بڑا شامیانہ ہے جس کی خوبصورت قناتوں کے اندر نسلی، علاقائی اور مذہبی اختلافات رکھنے والے کمزور گروہوں کو دلائل کے بجائے چھروں اور بلموں اور گولیوں سے ہم نوا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی ایک مُلک میں جمہوریت کی سب سے ابجد موجود نہیں۔ اس سے تو وہ آمریت بہتر ہے جو

[1] واضح رہے کہ یہ رپورٹیں آسامی اور بنگالی وقائع نگاروں کی فراہم کردہ ہیں۔ اور مغربی نامہ نگاروں نے بھی دلی میں بیٹھ کر انہی کی مدد سے اپنے ڈسپیچ تیار کیے۔ اس لیے دس، پندرہ ہزار اموات کے اعداد و شمار بالکل ناقابلِ اعتماد ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ ایسی ہے کہ جو مقتولین کی تعداد ۳۰ ہزار بتاتی ہے۔

اچھی ہوگی جہاں لوگوں کے جان، مال، آبرو میں اور ضمیر جمہوروں کی زد سے محفوظ ہوں۔ جمہوریت کا ایسا تماشا نہ ڈھونگ کس کام کا کہ آدمی کو محض اس بنا پر جان کے لالے پڑے ہوں کہ اس کا عقیدہ یا اس کی تہذیبی روایات مختلف ہیں۔ یا وہ نسل اور زبان اور علاقے کے لحاظ سے دوسروں سے فرق رکھتا ہے۔ پوری صحافت سیکولر نیشنل ہندو ازم کے سیلاب میں یکساں بہی جا رہی ہے۔ دھارے کے خلاف سر اٹھا کر بات کہنے والا کوئی نہیں۔ ادیبوں اور دانشوروں کا یہ حال ہے کہ ان کے کسی گروہ تو کیا، کسی فرد کی طرف سے بھی ہندوؤں کی بہیمانہ کارروائیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھی، ایسا ادب نہیں ابھرا جس سے ظاہر ہو کہ ادیب ان حالات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ حد یہ کہ ہندوؤں میں سے کوئی ایسا سیوا سمتی گروہ بھی کبھی نمودار نہیں ہوا جس نے مصیبت زدہ مسلمانوں کی کسی طرح امداد کی ہو۔ کوئی سادھو نہیں جس نے مرن برت رکھ لیا ہو، کوئی ایسے مہنت اور پجاری نہیں جو کسی چوراہے پر دھرنا مار کر بیٹھ جائیں، کوئی ایسی انسانیت دوست سماجی پارٹی موجود نہیں جو آسام جا پہنچے اور اس مصیبت کو سمجھے جو مسلمانوں پر وارد ہوئی ہے۔ ایسا کوئی انسانی رجحان موجود نہیں ہے وہاں تو محض ایک مسمی صورت۔ بنیوں کا نمائشی اخلاق اور دلفریب مصنوعی انکسار ملتا ہے اسی کو کہتے ہیں :۔ بغل میں چھری منہ پر رام رام

میں ایسی بنجر قوم کے متعلق یقین رکھتا ہوں کہ یہ خود جلد کسی سخت گرفت میں آ گئی جس سے اسے نہ اس کے اسلحہ بچا سکیں گے نہ اس کی عیارانہ سیاست اور نہ نمائشی جمہوریت۔ دوسری بات یہ کہ ایسی قوم کے متعلق یہ حسنِ ظن رکھنا کہ وہ اپنا محاسبہ آپ ہی کرے گا یکسر خود فریبی ہے اب اس قوم میں انسانیت کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔

بھارت سے مکمل مایوسی کے بعد میں مجبور ہوا ہوں کہ ایک مکتوب مفتوح لکھ کر اپنی دینی و دنیوی برادری کو توجہ دلاؤں کہ وہ اندرونی رضاکارانہ اصلاح کی امیدیں چھوڑ کر باہر سے مؤثر دباؤ ڈالے۔

اگر ایسے بڑے المیہ پر عالم اسلام بے حس رہا تو اس کا کوئی وقار باقی نہیں رہے گا۔